ہندوستان میں مشرقی تمدّن کا آخری نمونہ

یعنی

گذشتہ لکھنؤ

مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی

تصحیح و ترتیب

رشید حسن خاں

1992

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اِس کے تسلیم کرنے میں شاید کسی کو عذر نہ ہوگا کہ ہندوستان میں مشرقی تہذیب و تمدّن کا جو آخری نمونہ نظر آیا، وہ گذشتہ دربارِ اودھ تھا۔ اگلے دور کی یادگار اور بھی کئی دربار موجود ہیں، مگر جس دربار پر پُرانی تہذیب اور اگلی معاشرت کا خاتمہ ہوگیا، وہ یہی دربار تھا، جو بہت ہی آخر میں قائم ہوا اور عجیب و غریب ترقیاں دکھا کے، بہت ہی جلد فنا ہوگیا۔ لہٰذا مندرجۂ بالا عنوان کے تحت میں، ہم اُس مرحوم دربار کے مختصر حالات اور اُس کی خصوصیتوں کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

اِس کے تسلیم کرنے میں بھی شاید کسی کو عُذر نہ ہوگا کہ جس خطّۂ زمیں پر یہ پھیلا دربار قائم ہوا، اس کی وقعت اور اہمیت، ہندوستان کے تمام صوبوں سے بڑھی ہوئی ہے۔

پُرانے چندربنسی خاندان خصوصاً راجا رام چندر جی کے اعلا کارنامے اور عدیم النظیر ناموریاں اِس درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی ہیں کہ تاریخ کے ظرف کو تنگ اور محدود دیکھ کے، انھوں نے مذہبی تقدّس کا جامہ پہن لیا ہے۔ اور آج ہندوستان کا شاید، نادر ہی کوئی ایسا بدنصیب گانو ہوگا، جہاں اُن کی یاد ہر سال رام لیلا کے مذہبی ناٹک کے ذریعے سے تازہ نہ کرلی جاتی ہو۔ لیکن اودھ کے اُس قدیم ترین دیوتائی دربار کے حالات اور اجدّھیا کا اُس عہد کا جاہ و جلال، والمیکی نے ایسی معجز نُما فصاحت کے ساتھ دکھایا کہ وہ ہر عقیدت کیش کی لوحِ دل پر لکھ گیا۔ لہٰذا ہمیں اس کے اعادے کی ضرورت

نہیں۔ جن لوگوں نے اجدھیا کے پُرشکوہ زمانے کی تصویر والمیکی کے لٹریری مرقّع میں دیکھی ہے، وہ اُسی مبارک خطّے پر آج دلگداز میں، فیض آباد کی تصویر دیکھیں۔ لہٰذا ہم سلسلۂ واقعات کو اُس وقت سے شروع کرتے ہیں جب اِس آخری دربار کی بنیاد پڑی، جسے فنا ہوئے، کچھ اوپر پچاس سال سے زیادہ زمانہ نہیں ہوا۔

جب نوّاب بُرہان الملک امین الدین خاں نیشاپوری، شہنشاہِ دربارِ دہلی کی طرف سے صوبہ دارِ اودھ مقرّر ہو کے آئے، تو شیخ زادگانِ لکھنؤ کو مغلوب کر کے، قدیم مستقرِ اودھ یعنی محترم و مقدّس شہر اجدھیا میں پہنچے، اور آبادی سے فاصلے پر یعنی دریائے گھاگرا کے کنارے، ایک بلند ٹیلے پر اپنا خیمہ نصب کیا۔ چونکہ انتظامِ صوبہ کی محویت میں انھیں عالی شان عمارت بنانے کی فرصت نہ تھی، اور نہ اپنی سادہ مزاجی کی وجہ سے، ایسے نمایشی کرّ و فر کا انھیں شوق تھا، اِس لیے ایک زمانے تک خیموں میں بسر کی، اور جب چند روز کے بعد اُنھیں برسات میں تکلیف ہوئی، تو تھوڑی دُور ہٹ کے، ایک مناسب مقام پر اپنے لیے ایک چھپّر[1] بنوایا۔ پھر اُس کے بعد، اِس چھپّر کے گرد کچّی دیوار کا ایک بہت وسیع مُربّع حصار کھنچوا لیا، جس کے چاروں کونوں پر، قلعہ بندی کی شان سے، چار کچّے بُرج بنوا دیے، تاکہ گرد و پیش کی نگرانی کی جا سکے۔ یہ احاطہ اس قدر وسیع تھا کہ اس کے اندر متعدّد رسالے، پلٹنیں، توپ خانے، اصطبل اور دیگر ضروری کارخانے آسانی سے رہ سکتے تھے۔

بُرہان الملک کو چوں کہ عمارت کا شوق نہ تھا، اس لیے ان کے زنانے اور بیگمات کے قیام کے لیے بھی کچّے ہی مکانات بنا لیے گئے۔ غرض اس کچّے بنگلے میں، اُس وقت کا والیِ اودھ، جب اُسے اضلاع کے دَورے اور سفرہائے حکم رانی سے فراغت ہوتی، آرام

---

[1] فیض آباد کے یہ تمام حالات منشی محمد فیض بخش کی "تاریخِ فرح بخش" سے لیے گئے ہیں۔ اصل کتاب ہم نے نہیں دیکھی مگر اس کا انگریزی ترجمہ مترجمہ ولیم ہوئی جو ۱۸۸۹ء میں گورنمنٹ پریس الٰہ آباد میں چھپا ہے، ہمارے پاس موجود ہے۔

و آسایش کے ساتھ رہتا تھا اور کسی بات کی شکایت نہ تھی۔ اور اس کا یہ دارُالامارت چند روز میں "بنگلہ" کے نام سے مشہور ہو گیا۔

بُرہان الملک کے انتقال کے بعد، جب نوّاب صفدر جنگ کا زمانہ شروع ہوا، تو یہ بستی فیض آباد مشہور ہوئی۔ یہ ہے بنیاد شہر فیض آباد کی، جس نے اپنے بننے اور بگڑنے کی سرعت میں لکھنؤ کو بھی مات کر دیا۔ اب اُن دنوں اُس کچّی چار دیواری کے گرد اکثر مغل سردارانِ فوج نے اپنی دل چسپی کے لیے باغ اور پُرفضا و فرحت بخش نزہت گاہیں بنائیں، اور شہر کی رونق ترقی کرنے لگی۔ اُس کچّے احاطے کا ایک پھاٹک، دلّی دروازہ کہلاتا تھا، جو مغرب کی طرف تھا۔ اُس کے باہر دیوان آتمارام کے بیٹوں نے ایک شان دار بازار بنوایا اور اسی کے سلسلے میں رہنے کے لیے مکانات بھی تعمیر کرائے، اِسی طرح اسماعیل خاں رسال دار نے بھی ایک بازار بنوایا۔ اور چار دیواری کے اندر خواجہ سراؤں اور مختلف فوجی لوگوں کے بہت سے مکانات بھی تیار ہو گئے۔

نوّاب صفدر جنگ کی وفات کے بعد، اس نئی بستی پر چند روز کے لیے تباہی برس گئی، جس کی وجہ سے، اتنے دنوں میں جو کچھ بنا تھا، زمانے نے بگاڑ کے رکھ دیا۔ اِس لیے کہ اُن کے فرزند، نوّاب شجاع الدّولہ نے اپنی سکونت کے لیے لکھنؤ کو پسند کیا تھا اور وہیں رہتے تھے۔ گو سال میں دو ایک راتیں اپنے باپ دادا کے اس قدیم مسکن میں ضرور بسر کر لیا کرتے۔ یہاں تک کہ ۱۷۶۴ء میں انھیں بکسر کی لڑائی میں انگریزوں سے شکست ہوئی۔ اُس وقت وہ کمال بے سر و سامانی سے بھاگتے ہوئے فیض آباد میں آئے، اور وہاں کے قلعے میں جو کچھ ساز و سامان موجود پایا لے کے، راتوں رات چل کھڑے ہوئے اور لکھنؤ پہنچے۔ یہاں بھی ایک ہی رات قیام کر کے جو کچھ ہاتھ آیا لیا اور بریلی کی راہ لی، تاکہ افاغنۂ روہیلکھنڈ کے پاس جا کے پناہ لیں۔ لڑائی کے نو مہینے بعد انگریزوں سے اُن سے صلح ہو گئی، جس کی رُو سے شجاع الدّولہ کے ذمّے واجب تھا کہ

محاصلِ ملک میں سے پنج آنی انگریزوں کو ادا کیا کریں۔

صلح ہونے سے پہلے اس سفر میں اتفاقاً شجاع الدولہ کا گزر شہر فرخ آباد میں بھی ہوا تھا، جہاں احمد خاں بنگش سے ملاقات ہوئی، جو اُس زمانے کے پُرانے تجربہ کار شجاعوں میں خیال کیے جاتے تھے۔ اُنھوں نے شجاع الدولہ کو مشورہ دیا کہ اب کی جو تم جا کے عنانِ حکومت ہاتھ میں لینا، تو میری ان دو باتوں کو نہ بھولنا: ایک تو یہ کہ مغلوں کا کبھی اعتبار نہ کرنا، بلکہ اپنے دیگر ملازموں اور خواجہ سراؤں سے کام لو۔ دوسرے یہ کہ لکھنؤ کا رہنا چھوڑ دو، اور فیض آباد ہی کو اپنا دارالحکومت بناؤ۔

یہ باتیں شجاع الدولہ کے دل پر بیٹھ گئیں، اور انگریزوں سے معاہدہ ہونے کے بعد، ۱۷۶۵ء میں جو اُنھوں نے اپنی قلمرو کی راہ لی تو سیدھے فیض آباد آئے اور اسی کو اپنا دارالحکومت قرار دے دیا۔ اب یہاں انھوں نے نئی فوج بھرتی کرنا شروع کی، نئے رسالے مرتب کرنے لگے، اور نئی عمارتوں کی بنیاد ڈالی۔ پُرانے حصار کو ایک مضبوط شہر پناہ کی شان سے از سرِ نو تعمیر کرایا، جو اب قلعہ کہلاتا تھا۔ مغلوں کے جو مکانات اندر واقع تھے، ڈھا دیے۔ اور اپنے اکثر خانگی ملازموں کو حکم دیا کہ شہر پناہ کے باہر مکان بنوائیں۔ اُس حصار کے گرداگرد ہر طرف دو دو میل کا میدان چھوڑ دیا گیا، جس کے گرد گہری خندق کھود کے، قلعہ بندی کی وضع سے درست کی گئی۔ اور ملازمین سرکار اور افسرانِ فوج کو اجازت ہوئی کہ اپنی حیثیت اور حالت کے مناسب قطعاتِ زمین لے کے، اسی میدان میں مکان بنائیں۔ جیسے ہی یہ خبر مشہور ہوئی کہ شجاع الدولہ نے فیض آباد کو اپنا مستقر قرار دیا ہے، ایک دنیا کا رُخ ادھر پھر گیا۔ ہزارہا خلقت آ آ کے آباد ہونا شروع ہوئی۔ شاہ جہاں آباد میں یہ حالت تھی کہ جسے دیکھیے، فیض آباد جانے کے لیے تیار ہے۔ چناں چہ دہلی کے اکثر باکمالوں نے وطن کو خیر باد کہی اور پورب کا رُخ کیا۔ شب و روز لوگوں کے آنے کا تانتا بندھا

رہتا تھا اور قافلے پر قافلے چلے آتے تھے۔ جو آ کے یہاں بستے، اور فیض آباد کے سواد میں کھپتے جاتے تھے۔ چند ہی روز کے اندر ہر قوم و ملت کے خوش باش، اہلِ قلم، اہلِ سیف، تاجر، صنّاع، اور ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگ یہاں جمع ہو گئے۔ اور جو آتا، آتے ہی اس فکر میں پڑ جاتا کہ کوئی قطعۂ زمین حاصل کر کے مکان بنالے۔

چند ہی سال کے اندر، اُس پہلے حصار کے علاوہ دو اور فصیلیں تعمیر ہو گئیں، ایک جو پہلے مربع کے جنوبی پہلو سے ملی ہوئی تھی۔ اُس کے رقبے کا طول و عرض دو دو میل کا تھا۔ اور دوسرا حصار، ایک میل کے پھیلاؤ میں تھا جو قلعے اور بیرونی فصیل کے درمیان تھا۔ اُسی زمانے میں ترپولیا اور چوک بازار تعمیر ہوئے، جن کی سڑک، قلعے کے جنوبی پھاٹک سے شروع ہو کے سڑک الٰہ آباد کے نکڑ تک چلی گئی تھی اور اتنی کشادہ تھی کہ برابر دس چھکڑے آسانی سے گزر سکتے تھے۔ فصیلِ شہر کا آثار، زمین کے پاس جا ہے جتنا ہو، درمیان میں دس گز سے کم نہ تھا جو اوپر پہنچ کے پانچ گز رہ گیا تھا۔ اِس فصیل پر قاعدہ اور بے قاعدہ دونوں طرح کی فوجوں کے دستے رات بھر روند پھرا کرتے اور جابجا پہرہ دیتے۔ باقاعدہ سپاہیوں کی وردی لال تھی اور بے قاعدہ سپاہیوں کی وردی سیاہ۔ انھی سپاہیوں کی ضرورت سے برسات میں جابجا چھپر ڈال دیے جاتے۔ مگر برسات کے ختم ہوتے ہی، آگ لگنے کے اندیشے سے، وہ لازمی طور پر اتار ڈالے جاتے۔ چنانچہ صرف فصیل کی دیواروں کے لیے ہر سال تقریباً ایک لاکھ چھپر چھائے، اور چار مہینے بعد نوچ کے پھینک دیے جاتے۔

حوالیِ شہر میں دو مرغزار، شکار گاہ قرار دیے گئے تھے جن میں سے ایک مغرب کی جانب، گرجی بیگ خاں کی مسجد سے گپتار گھاٹ تک چلا گیا تھا، جو ایک معتدبہ مسافت ہے۔ اس کے دونوں طرف کچی دیواریں تھیں اور تیسری طرف گھاگرا واقع ہوئی تھی۔ اس میں ہرن، چیتل، بارہ سنگھے، نیل گائیں وغیرہ

شکار کے جانور کثرت سے چھوڑے گئے تھے، جو نہایت آزادی سے چھوٹے چھوٹے پھرتے اور بھڑکتے ہی چوکڑیاں بھرنے لگتے۔ دوسری شکارگاہ، شہر سے مشرق کی طرف موضع جنورا اور چھاؤنی گوشائیں سے دریا کے کنارے تک تھی، جس کا پھیلاؤ چھے میل کا تھا۔ اس کے رقبے میں گیارہ موضع اور ان کی آراضی آگئی تھی۔ مگر یہ شکارگاہ ناتمام ہی رہی اور اس کی نوبت نہ آنے پائی کہ اس میں وحشی جانور چھوڑے جائیں۔

خاص شہر کے حلقے کے اندر تین ایسے تزہت بخش باغ تھے جو اس قابل تھے کہ اُمرا اور شاہ زادے آکے، ان میں سیر کریں اور ان کی بہار اور شادابی سے لطف اٹھائیں۔ ایک انگوری باغ، جو قلعے کے اندر واقع تھا اور اُس کے رقبے کے چوتھائی حصے پر حاوی تھا۔ دوسرا موتی باغ، جو عین چوک کے اندر واقع تھا۔ تیسرا لال باغ، جو سب باغوں سے زیادہ وسیع تھا۔ اس میں نہایت ہی نفاست سے چمن بندی کی گئی تھی اور ہر طرح کے نازک و نظر فریب پھول قرینے سے لگائے گئے تھے۔ سارے صوبے میں اس کی شہرت تھی، اور دُور دُور کے لوگوں کو تمنا تھی کہ کوئی خوش نصیبی کی شام اس روح افزا باغ میں بسر کریں۔ شہر کے نوجوان شرفا کے غول روز سہ پہر کو اس میں گشت لگاتے اور دل بہلاتے نظر آتے۔ اس باغ کی جاں فزائی کی شہرت یہاں تک تھی کہ شہنشاہِ دہلی شاہ عالم بادشاہ جب الٰہ آباد سے پلٹے تو اسی باغ کی سیر کے شوق میں فیض آباد ہوتے ہوئے دہلی گئے اور کچھ زمانے تک اسی کے اندر ان کا قیام رہا۔ ان تین باغوں کے علاوہ، آصف باغ اور بلند باغ بھی نواحِ شہر میں، لکھنؤ کے راستے پر واقع تھے۔

نوّاب شجاع الدّولہ بہادر کو شہر کی درستی کا اس قدر شوق تھا کہ ہر صبح و شام سوار ہو کے، سڑکوں اور مکانوں کا معائنہ کرتے۔ مزدور، پھڑوے اور کُدالیں لیے ہوئے ساتھ ہوتے، جہاں کہیں کسی مکان کو ٹیڑھا اور اپنی حد سے بڑھا ہوا پاتے یا کسی دکان دار

کو دیکھتے کہ اُس نے سڑک کی زمین بالشت بھر بھی دبالی ہے، فوراً اُسے کھُدوا کے برابر اور سیدھا کرا دیتے۔

فوج کی اصلاح کی طرف بھی شجاع الدّولہ کو خاص توجہ تھی۔ رسالے کے اعلا افسر نوّاب مرتضا خاں بریچ اور ہمّت بہادر اور امراؤ گیر نام دو گوشائیں تھے۔ اِن کے ماتحت اتنے سوار تھے کہ ان تین کے علاوہ، اور جتنے چھوٹے چھوٹے جمعدار تھے، سب کی فوج کی مجموعی تعداد سے، اِن میں سے ہر ایک کی جمعیّت زیادہ تھی۔ دیگر سرداران فوج احسان کمبوہی، گرجی بیگ خاں، گوپال راؤ مرہٹا، میر حملہ کے داماد نوّاب جمال الدین خاں، مظفر الدّولہ تہوّر جنگ بخشی ابوالبرکات خاں ساکنِ کاکوری، اور محمد معزّ الدّین خاں لکھنؤ کے ایک شیخ زادے تھے۔ ان میں سے کوئی نہ تھا جس کے ماتحت ہزار پانسو سپاہیوں کا گروہ نہ ہو۔ ماسوا ان کے، خواجہ سرا اور وہ نوعمر خواجہ سرا جو ان کے زیرِ نگرانی تربیت پاتے، چیلے، اور شاگرد پیشہ تھے۔ بسنت علی خاں خواجہ سرا کے ماتحت دو ڈویژن فوج یعنی چودہ ہزار باقاعدہ سپاہ تھی۔ جس کی وردی سرخ تھی۔ ایک دوسرا بسنت خواجہ سرا تھا، جس کے زیرِ کمان ایک ہزار بے قاعدہ نیزہ باز سوار اور ایک پلٹن تھی۔ عنبر علی خاں خواجہ سرا کی افسری میں پانسو سوار اور ایک پلٹن تھی، جن کی وردیاں سیاہ تھیں۔ محبوب علی خاں خواجہ سرا کے زیرِ علَم پانسو سوار تھے اور چار پلٹنیں تھیں۔ اتنی ہی فوج لطافت علی خاں کے ماتحت تھی۔ رگھوناتھ سنگھ اور پرشاد سنگھ میں سے ہر ایک کے زیرِ کمان تین تین سو سوار اور چار چار پلٹنیں تھیں۔ اسی طرح مقبول علی خاں اوّل و دوم یوسف علی خاں کے ہمراہ پان پان سو مغل سواروں اور پیدلوں کی جمعیّت تھی۔ اور توپ خانہ بے حد و بے حساب تھا۔

لہٰذا کُل فوج جو شجاع الدّولہ کے قبضے میں تھی، اور فیض آباد میں موجود رہا کرتی تھی، اُس کی مجموعی تعداد یہ تھی: سُرخ وردی والے تیئس ہزار باقاعدہ، اور سیاہ وردی والے

چالیس ہزار بے قاعدہ پیادے۔ ان کے افسرِ اعلا یعنی سپہ سالارِ اعظم، سیّد احمد تھے، جو "بانسی والا" کے لقب سے مشہور تھے۔ جلدی بھرنے اور فیر کرنے کے اعتبار سے ان کی توڑے دار بندوقوں کے مقابلے میں، انگریزی فوج کی بندوقیں کوئی وقعت نہ رکھتی تھیں۔

اِس جمعیت کے علاوہ شجاع الدّولہ کے پاس بائیس ہزار ہرکارے اور مخبر تھے، جو ہر ساتویں روز پونہ سے، اور ہر پندرھویں دن کابل سے خبریں لاتے۔ دربار میں ہمیشہ بلادِ دور دراز کے حکم رانوں کے نائب موجود رہا کرتے۔ ایک نائب مرہٹوں کا تھا، ایک نظام علی خاں فرماں روائے دکن کا، ایک ضابطہ خاں کا، اور ایک نوّاب ذوالفقار الدّولہ نجف خاں کا، جن کے ساتھ اُن کے دفتر اور سپاہی بھی تھے۔ اِن لوگوں کے علاوہ اور بھی بہت سے فوجی افسر اپنی جمعیّتوں کے ساتھ یہاں موجود رہتے۔ جیسے میر نعیم خاں جن کے جھنڈے کے نیچے ثابت خانی، بُندیل کھنڈی، چندیلا، اور میواتی سپاہیوں کا ہجوم تھا۔

محمد بشیر خاں قلعہ دار تھے۔ شہر کی فصیلوں اور پھاٹکوں پر اُنھی کے سوار اور پیادے پھیلے رہتے، اور قلعے کے اندر ہی ان کے رہنے اور دفتر کے لیے عمدہ مکانات اور اُن کے سپاہیوں کی بارکیں بنی ہوئی تھیں۔ جب بیرونی دیواروں میں بھی جگہ باقی نہ رہی تو سیّد جمال الدّین خاں اور گوپال راؤ مرہٹے نے باہر نکل کے، موضع نوراہی کے پاس سکونت اختیار کی اور اپنے مکانات اور کیمپ وہاں بنائے۔ اور اسی جگہ کی تنگی کی وجہ سے نوّاب مرتضا خاں بریچ، میر احمد بانسی والا، میر ابوالبرکات اور شیخ احسان اجُدھیا اور فیض آباد کے درمیان، خیموں میں رہتے تھے۔

آدمیوں کی کثرت اور سپاہیوں کے ہجوم سے شہر کے اندر، خصوصاً چوک میں، اس قدر بھیڑ لگی رہتی کہ گزرنا دشوار تھا اور غیر ممکن تھا کہ کوئی شخص بغیر لڑکے ہوئے سیدھا

چلا جائے۔ فیض آباد نہ تھا، انسانوں کا جنگل تھا۔ بازار میں دیکھیے تو ملکوں ملکوں کا مال ڈھیر تھا اور یہ خبر سن کے کہ فیض آباد میں نفیس مزاج رئیسوں اور شوقین امیروں کا منتخب مجمع ہے، ہر طرف سے تاجروں کے قافلے لدے پھندے چلے آتے تھے۔ اور چوں کہ چاہے کیسا ہی قیمتی مال ہو، ہاتھوں ہاتھ بک جاتا، اچھی سے اچھی چیزوں کے آنے کا سلسلہ بندھ گیا تھا۔ جب دیکھیے ایرانی، کابلی، چینی، فرنگی سوداگر نہایت گراں قیمت اور بھاری مال لیے ہوئے موجود رہتے۔ اور جو جو نفع اٹھاتے، ہوس بڑھتی اور زیادہ جستجو و جاں فشانی سے نیا مال لے آتے۔ مسیو تھان تیل، مسیو سون سون، اور مسیو پیار روز وغیرہ کے ایسے دو سو فرانسیسی جو یہاں اقامت گزین ہو گئے تھے، سرکار میں ملازم تھے۔ اور شجاع الدّولہ کی سلطنت سے روابطِ اتحاد رکھتے تھے، جو سپاہیوں کو فوجی تعلیم دیتے اور توپیں، بندوقیں اور دیگر اسلحۂ جنگ اپنے اہتمام میں تیار کراتے۔

منشی فیض بخش، مصنّفِ تاریخِ فرح بخش، جن کی عنایت سے ہمیں یہ واقعات معلوم ہوئے ہیں، خود اُس زمانے میں موجود تھے، اور اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اپنے مشاہدے سے لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں جب پہلے پہل گھر چھوڑ کے فیض آباد میں گیا ہوں، ممتاز نگر ہی تک پہنچا تھا جو شہر کے مغربی پھاٹک سے چار میل کے فاصلے پر ہے، میں نے دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے انواع و اقسام کی مٹھائیاں، گرما گرم کھانا، کباب، سالن، روٹیاں اور پراٹھے وغیرہ پک رہے ہیں۔ سبیلیں رکھی ہوئی ہیں۔ نان خطائیاں، مختلف قسم کے شربت اور فالودہ بھی بک رہا ہے۔ اور صدہا آدمی خریداری کے لیے اُن دُکانوں پر گرے پڑتے ہیں۔ مجھے خیال گزرا کہ میں شہر کے اندر داخل ہو گیا اور خاص چوک میں ہوں، مگر متحیّر تھا کہ ابھی تک شہر کا پھاٹک تو آیا ہی نہیں، میں اندر کیسے پہنچ گیا؟ لوگوں سے پوچھا تو ایک راہ گیر نے کہا: جناب، شہر کا پھاٹک یہاں سے چار میل ہے، آپ کس خیال میں ہیں!

اِس جواب پر حیرت کرتا ہوا میں شہر میں داخل ہوا تو عجب چہل پہل نظر آئی۔ رنگینیاں تھیں اور دل چسپیاں۔ جدھر دیکھتا ہوں ناچ ہو رہا ہے، مداری تماشا کر رہے ہیں اور لوگ طرح طرح کے سیر تماشوں میں مصروف ہیں۔ میں یہ رونق اور شور و ہنگامہ دیکھ کے مبہوت رہ گیا۔ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک کوئی وقت نہ ہوتا جب فوجوں اور پلٹنوں کے نقاروں کی آواز نہ سنی جاتی ہو۔ پہروں اور گھڑیوں کے بتانے کے لیے بار بار نوبت بجتی اور گھڑیالوں پر موگریاں پڑتیں، جن کے شور و غل سے کان اُڑے جاتے۔ سڑکوں پر دیکھیے تو ہر دم گھوڑوں، ہاتھیوں، اونٹوں، خچروں، شکاری کتوں، گائے بھینسوں بیلوں، چھکڑوں اور توپوں کے گزرنے کا سلسلہ جاری رہتا۔ جن کا شمار حساب اور اندازے سے باہر تھا۔ راستہ چلنا دشوار تھا۔

ایک عجیب رونق و تمکنت کا شہر نظر آیا جس میں وضع دارانِ دہلی میں سے خوش پوشاک اور وضع دار شریف زادے، حاذق اطبائے یونانی، اعلا درجے کے مردانے اور زنانے طائفے، ہر شہر اور ہر مقام کے مشہور اور باکمال گویّے، سرکار میں ملازم تھے اور بڑی بڑی تنخواہیں پاکے، عیش و فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے۔ ادنا و اعلا سب کی جیبیں روپیوں، اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اور ایسا نظر آتا کہ جیسے یہاں کبھی کسی نے افلاس و احتیاج کو خواب میں بھی نہیں دیکھا ہے۔ نواب وزیر (شجاع الدولہ بہادر) شہر کی سرسبزی و رونق اور رعایا کی مُرفہ الحالی میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ چند ہی روز میں فیض آباد، دہلی کی ہم سری کا دعوا کرے گا۔

چوں کہ کسی مملکت اور کسی شہر کا رئیس اس نفاست اور شان و شکوہ سے نہیں رہتا تھا جس طرح نواب شجاع الدولہ رہتے تھے، اور اس کے ساتھ ہی یہ نظر آتا تھا کہ کہیں کے لوگ اس بے جگری سے ہر کام میں اور ہر موقع و محل پر دولت صرف کرنے کو نہیں تیار ہو جاتے تھے، اِس لیے ہر قسم کے اور ہر جگہ کے اعلا دست کاروں،

صنّاعوں، اور طالب علموں نے وطنوں کو خیرباد کہہ کے، فیض آباد ہی کو اپنا مسکن بنا لیا اور یہاں ہر زمانے میں ڈھاکے، بنگالے، گجرات، مالوہ، حیدر آباد، شاہجہان آباد لاہور، پشاور، کابل، کشمیر، اور ملتان وغیرہ کے طالب علموں کا ایک بڑا بھاری گروہ موجود رہتا، جو علما کی درس گاہوں میں تعلیم پاتے اور اُس چشمۂ علم سے، جو فیض آباد میں جاری تھا، سیراب ہو ہو کے اپنے گھروں کو واپس جاتے۔ کاش نواب وزیر اور دس بارہ برس جی جاتے، تو گھاگرا کنارے ایک نیا شاہجہاں آباد آباد ہو جاتا۔ اور دنیا ایک نئی زندہ دہلی کی صورت دیکھ لیتی۔

یہ نواب شجاع الدولہ کے صرف نو سال کے قیام کا نتیجہ تھا، جس نے فیض آباد کو ایسا بنا دیا۔ اور ان نو سال میں بھی صرف برسات کے چار مہینے وہ شہر میں رونق افروز رہتے، باقی زمانہ اپنی قلمرو کے دورے اور سیر و شکار میں صرف ہوتا تھا۔ شجاع الدولہ کا طبعی میلان مہ جبیں عورتوں اور رقص و سرود کی طرف تھا جس کی وجہ سے بازاری عورتوں اور ناچنے والے طائفوں کی شہر میں اس قدر کثرت ہو گئی تھی کہ کوئی گلی کوچہ ان سے خالی نہ تھا۔ اور نواب کے انعام و اکرام سے وہ اس قدر خوش حال اور دولت مند تھیں کہ اکثر رنڈیاں ڈیرہ دار تھیں، جن کے ساتھ دو دو تین تین عالی شان خیمے رہا کرتے۔ اور نواب صاحب جب اضلاع کا دورہ کرتے اور سفر میں ہوتے تو نوابی خیموں کے ساتھ ساتھ، اِن کے خیمے بھی شاہانہ شکوہ سے چھکڑوں پر لد لد کے روانہ ہوتے اور ان کے گرد دس دس بارہ بارہ تلنگوں کا پہرا رہتا۔ اور جب حکم راں کی یہ وضع تھی تو تمام اُمرا اور سرداروں نے بھی بے تکلف یہی وضع اختیار کر لی اور سفر میں سب کے ساتھ رنڈیاں رہنے لگیں۔ اگرچہ اس سے بداخلاقی اور بے شرمی کو ترقی ہو گئی، لیکن اس میں شک نہیں کہ اُن شاہدانِ بازاری کی کثرت اور امرا کی شوقینی سے، شہر کی رونق بدرجہا زیادہ بڑھ گئی تھی اور فیض آباد، دُلھن بن گیا تھا۔

۱۷۷۳ء میں شجاع الدّولہ نے مغرب کا سفر کیا۔ اس سفر میں شاہی کیمپ کی رونق اور چہل پہل بیان سے باہر تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ نوابی علم اقبال کے ساتھ ساتھ ایک بڑا بھاری شہر سفر کر رہا ہے۔ لکھنؤ ہوتے ہوئے اٹاوہ پہنچے جس پر مرہٹے قابض تھے۔ ایک ہی حملے میں، اُسے اُن سے چھین کے، اپنے قبضے میں کیا۔ اور احمد خاں بنگش کی قلمرو میں داخل ہوکے، کوڑیا گنج اور کاس گنج میں خیمہ زن ہوئے۔ یہاں سے انھوں نے حافظ رحمت خاں فرماں روائے بریلی کو لکھا: "گذشتہ سال میں نے ایک کروڑ روپے، مہاجی سندھیا مرہٹے کو بھیجے تھے جس نے آپ کا وہ تمام علاقہ جو درمیانِ دوآب ہے، آپ سے چھین لیا تھا۔ وہ رقم ادا کرکے، میں نے آپ کا وہ علاقہ اس کے قبضے سے چھڑایا اور آپ کے حوالے کردیا۔ لہٰذا اب پچاس لاکھ کی رقم جو آپ کی طرف سے میں نے ادا کی تھی، فوراً ادا کیجیے۔"

حافظ رحمت خاں نے اپنے تمام افغان سرداروں اور بھائی بندوں کو جمع کرکے کہا: "شجاع الدّولہ لڑائی کے لیے بہانہ ڈھونڈھ رہے ہیں، مناسب یہ ہے کہ یہ مطلوبہ رقم ادا کردی جائے۔ بیس لاکھ میں اپنے پاس سے دیتا ہوں اور مابقی تیس لاکھ تم جمع کردو۔"

ناعاقبت اندیش پٹھان سرداروں نے جواب دیا: "شجاع الدّولہ کے آدمی دیکھنے ہی کے ہیں، وہ بھلا ہم سے کیا مقابلہ کریں گے؟ باقی رہی انگریزی فوج جو اُن کے ساتھ ہے، تو اُن کی توپوں پر جس وقت ہم تلواریں سُوت سُوت کے جا پڑیں گے، سب کے حواس جاتے رہیں گے۔ دینے لینے کی کچھ ضرورت نہیں۔" حافظ رحمت خاں نے یہ سن کے کہا: "تمھیں اختیار ہے، مگر میں ابھی سے کہے رکھتا ہوں کہ اگر لڑائی کا رنگ بدلا تو میں میدان سے زندہ نہ آؤں گا، اور اس کا جو انجام ہوگا، وہ تمھیں کو بھگتنا پڑے گا۔"

بہرتقدیر، شجاع الدّولہ کو اپنی خواہش کے موافق جواب نہ ملا، فوج لے کے چڑھ گئے۔ لڑائی ہوئی اور لڑائی کا انجام وہی ہوا جسے تقدیر نے حافظ رحمت خاں کی زبان سے پہلے ہی سنوا دیا تھا۔ حافظ رحمت خاں شہید ہوئے اور اُن کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ مگر یہ

فتح شجاع الدّولہ بہادر کو بھی سزاوار نہ ہوئی۔ ۱۳ صفر ۱۱۸۸ھ ۱۷۷۴ء کو لڑائی ہوئی تھی، ۱۱ شعبان کو شجاع الدّولہ بریلی سے کوچ کرکے لکھنؤ آئے۔ ماہِ مبارک رمضان لکھنؤ میں بسر کیا۔ ۸ شوال کو لکھنؤ سے کوچ کرکے، ۱۴ کو فیض آباد میں داخل ہوئے۔ اور فتح کو ۹ مہینے دس ہی دن ہوئے تھے اور گھر میں پورے ڈیڑھ مہینے بھی آرام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ ۲۳ ذیقعدہ ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۴ء) کو وہ گرلے عالمِ جاوداں ہوئے۔ اور افسوس، ان کی وفات ہی کے ساتھ فیض آباد کی ترقی کا دور بھی ختم ہوگیا۔

اُس وقت حکومتِ اودھ میں سب سے بڑا اثر نواب شجاع الدّولہ بہادر کی بی بی، بہو بیگم صاحبہ کا تھا، جو نہایت ہی دولت مند بھی سمجھی جاتی تھیں۔ اُن کی منظوری سے نواب آصف الدّولہ مسندنشینِ حکومت ہوئے۔ مگر ان کی اخلاقی حالت نہایت خراب تھی اور مصاحبوں کو مناسب معلوم ہوا کہ ماں بیٹوں کو الگ رکھیں۔ چند روز تک سیر و شکار میں مصروف رہنے کے بعد، نواب آصف الدّولہ بہادر نے لکھنؤ میں قیام اختیار کرلیا اور یہیں بیٹھے بیٹھے ماں کو ستایا کرتے اور بار بار اُن سے روپیا طلب کرتے۔

بہو بیگم صاحبہ کے موجود رہنے سے، فیض آباد کو اُن کی زندگی تک تھوڑی بہت رونق حاصل رہی۔ اگرچہ اُن کی زندگی میں بھی نواب آصف الدّولہ کی نالائقیوں نے بیگم صاحبہ کے اطمینان میں اور اس کی وجہ سے فیض آباد کے امن و امان میں خلل ڈالا، مگر اُس محترم خاتون کی زندگی تک، وہ جھگڑے اور ہنگامے بھی ایک گونہ باعثِ رونق ہوجایا کرتے تھے۔ اُن کی وفات پر فیض آباد کی تاریخ ختم ہوگئی اور لکھنؤ کا دور شروع ہوا جس کا حال ہم آیندہ لکھیں گے۔

(۲)

ٹھیک کسی کو نہیں معلوم کہ لکھنؤ کی آبادی کی بنیاد کب پڑی؟ اس کا بانی کون تھا؟ اور وجہِ تسمیہ کیا ہے؟ لیکن مختلف خاندانوں کی قومی روایتوں اور قیاسات سے